مجید امجد کی نظموں کا رنگِ آخر

Late style of Majid Amjad's Poems

ڈاکٹر احتشام علی

Abstract

'Late style' is a critical theory of the modern era in which the work done in the later years of an artist is analyzed. Majid Amjad is reckoned as one of the most prominent poets of Modern Urdu Poem. In this article, an effort has been made to throw light on his poems written in his later age in the context of the above-mentioned theory.

Key Words:Late Style, Majid Amjad, Modern Urdu Poem, Critical theory, Last age poems of Majid Amjad

مجید امجد کی آخری عمر کی نظمیں جنھیں خواجہ محمد زکریا صاحب نے کلیاتِ مجید امجد کی تدوین کے وقت 'فردا' کا نام دیا ہے حقیقی معنوں میں وہ خالص شاعری ہے، جس کی تفہیم کی ذمہ داری معاصر ناقدین پر ہی نہیں بلکہ اگلے زمانے کے شعری پارکھوں پہ بھی ایک قرض رہے گی۔ معروف جرمن فلاسفر اور ماہر عمرانیات تھیوڈر اوڈرنو نے جرمن موسیقار بیتھون کی آخری عمر میں تخلیق کی گئی سمفنیز (Symphonies) کو ایک نئے تناظر Late Style کے ذریعے مطالعہ کا موضوع بنایا تھا۔ ایڈورڈ سعید نے اوڈرنو کی اسی تھیوری کو پیش نظر رکھتے ہوئے جب بہت سے مغربی شاعروں اور ادیبوں کی آخری عمر کی تحریروں کا محاکمہ کیا تو اُسے یہ تحریریں 'حقیقتوں کی معجزانہ تقلیب' (Miraculous Transfiguration of Reality) نظر آئیں۔ ایڈورڈ سعید نے شیکسپیئر، چاسر، سوفوکلیز، ابسن اور دوسرے کئی مغربی تخلیق کاروں کی آخری عمر کی تحریروں میں ایسے عناصر کی نشان دہی کی ہے، جن کے تحت ایک بڑا تخلیق کار اپنے مادی وجود پر مسلط کی گئی موت کا اثبات تو کر لیتا ہے، لیکن اپنے فن کے دوام کا غیر متزلزل یقین اُس کی تحریروں کو یکسر ایک نئے اسلوب میں ڈھالتا چلا جاتا ہے۔ اُردو ادب میں خدائے سخن میر تقی میر کے دیوان ششم میں موجود اڑھائی سو کے قریب غزلوں اور مجید امجد کی آخری عمر کی نظموں کا ایک ہی بحر میں ہونا کوئی اتفاقیہ بات نہیں ہے، بلکہ یہ اُس late style یا 'رنگِ آخر' ہی کا اعجاز ہے جس کے تحت تخلیق کار، اپنے بھر بھرے وجود اور فانی دنیا سے ماورا ہو کر اُن داخلی منطقوں کی سیاحت پر نکل جاتا ہے، جہاں نت نئی آفاقی اور دائمی حقیقتیں اُس کی منتظر ہوتی ہیں۔ اپنی باطنی کائنات کی سیاحت کے دوران مجید امجد نے جو لسانی پیرایہ اختیار کیا وہ اپنے کھردرے آہنگ کی وجہ سے قاری کی سماعت کو مسلسل ایک امتحان سے گزارتا ہے یہی وجہ ہے کہ مجید امجد، خواجہ محمد زکریا صاحب کو انٹرویو دیتے ہوئے ان نظموں کی قرأت کے لیے قاری کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ

''ان نظموں کے مضمون کا تقاضا ہے کہ پڑھنے والا رک کر پڑھے گا تو میری نظم کو Enjoy کر سکے گا اور اگر رواں پڑھے گا تو وہ اسے Miss کرے گا جس پر میں Insist کرتا ہوں''(۱)

مجید امجد کی نظموں کا یہ 'رنگِ آخر' ۱۹۶۸ء سے شروع ہو کر اُن کی وفات ۱۹۷۴ء تک کے دورانیے پر محیط ہے۔ اگر ہم زمانی ترتیب سے اِن نظموں کا جائزہ لیں تو اِس مرکوز مطالعہ کے دوران بعض انتہائی اہم نکات قاری کی توجہ اپنی سمت مبذول کرواتے ہیں۔ مثال کے طور پر فردا کی تیسری نظم جو جون ۱۹۶۸ء میں لکھی گئی کے چند مصرعے دیکھیے:

دنیا مرے لیے تھی اِک بے مصرف مصروفیت
جیسے تھا ہی نہیں میں اس دنیا میں
جیسے موت مرے جی میں جینے آئی ہو
پھر جب اُن کے کرم سے اُن کا نام مرے ہونٹوں پر آیا
سارا زمانہ، سب تقدیریں، دنیائیں اور چاند ستارے
سب کچھ تھا بس ایک تموج
لہریں میں جن میں بہتا تھا،
لہریں جو میرے جی میں بہتی تھیں،
میں تو اس قابل بھی نہیں تھا۔۔۔
یہ سب اُن کا کرم تھا
وہ مجھ کو یاد آئے تھے،
میں نے اُن کو یاد کیا تھا!(۲)
(دنیا مرے لیے تھی)

کسی کو یاد کرنا، یا کسی کا یاد آنا خالصتاً ایک قلبی عمل ہے اور اِس کا تعلق انسان کی اُس باطنی دنیا سے ہے ،جس تک کسی دوسرے وجود کی رسائی ممکن نہیں ہوتی۔ درج بالا نظم اس بات کی مظہر ہے کہ دنیا کو ایک 'بے مصرف مصروفیت' قرار دے کر، ہر سانس میں بہ خوشی موت جینے والا اپنے باطن میں ایک پورا جہاں آباد کیے ہوئے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ متکلم کی قلبی دنیا کا کوئی دور افتادہ گوشہ کسی ایسے وجود سے آباد رہتا ہے، جس کا نام ہونٹوں پر آتے ہی سارا زمانہ، سب تقدیریں، دنیائیں اور چاند ستارے تموج میں آجاتے ہیں۔ اوپر درج نظم کے آخری مصرعے دراصل انھی کیفیات کی تجسیم ہیں، جن کی سرشاری اور بے خودی سے ہم کنار ہونے کے بعد، شاعر کے لیے بیرونی دنیا کسی پر کاہ

سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی۔اِسی لیے تو وہ 'فردا' کی اگلی ہی نظم میں اِس طرح مخاطب ہوتا ہے:

اپنی آنکھ پہ پٹی باندھ کے دیکھو،
اپنی اوٹ سے اپنے آپ کو دیکھو
اندھیارے میں سوچو!
کس کے ٹھنڈے، مشفق، حکمت والے ہاتھ تھے، جن میں
ٹھنڈی، تیز، کٹیلی، دھار تھی دکھ کی،
چرتی جلد سے گرتی، انگاراسی بوندیں
یہ اِک سانس تو شاید
میلی گیلی کافوری مٹی کا بچھونا۔۔۔
اسی بچھونے سے میں اٹھا،
سدا جئیں وہ ٹھنڈے ہاتھ، جنھوں نے پٹی باندھی
اب آنکھوں پر پٹی باندھ کے دیکھا، یہ دنیا کتنی اچھی ہے!
تنہا بیٹھ کے سوچا،
اس اک اتنی اچھی دنیا میں بھی
کون ادھر کو میری جانب دیکھے گا
جب تک میری آنکھوں پر پٹی ہے!(۳)
(اپنی آنکھ پہ۔۔۔۔)

اوپر درج دونوں نظمیں زمانی ترتیب سے یکِ بعد دیگرے ہیں اور اِس طرح محسوس ہوتا ہے جس طرح نظم نگار نے ایک ہی کیفیت کو دو مختلف انداز میں بیان کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دونوں نظموں میں بیان کیا گیا شعری تجربہ بہ ظاہر مختلف ہونے کے باوجود داخلی طور پہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔مثال کے طور پہ پہلی نظم میں 'کرم کرنے والا' اور دوسری نظم میں 'پٹی باندھنے والا وجود' تخلیق کار کے لیے مسیحائی کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔یاد رہے کہ 'فردا' کی مزید نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے، ہمیں جگہ جگہ اس وجود سے سابقہ پڑتا ہے، جو نظموں کے متن میں نظم نگار کی انگلی تھامے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔مثال کے طور پہ ایک اور نظم 'وہ بھی اک کیا نام ہے۔۔۔' کے پہلے چند ابتدائی مصرعے دیکھیے:

وہ بھی کیا اک نام ہے جو ہر دم ہے

ہم ہیں اور نہیں ہیں
ہم اور باقی، جو کچھ بھی ہے
اِس کا ہونا، اُس کے نہ ہونے کی خاطر ہے،
پھر اس اک اک ہونی کا ہے جدا جدا اک نام بھی اپنا
اپنے اپنے نام ہیں چیزوں کے اور آدمیوں کے
اِک اِک نام کے جسم ہیں، یہ سب چیزیں!
نام اِن جسموں میں جیتے ہیں
نام ان جسموں میں بے جسم ہیں اور جیتے ہیں
آج تو میں نے دیکھا، میرے جسم میں میرا نام نہیں تھا
جیسے اِک احساس کی زد سے
مجھ میں میرا باطن ڈوب چلا ہو(۴)

نظم کیا ہے، چار سو پھیلے وقت کے خلا میں اپنے بے نشاں ہوتے ہوئے وجود کو بچانے کے لیے لگائی گئی ایک تخلیقی جست ہے۔ نظم کی ابتدا میں متکلم کو اپنے اردگرد پھیلی ہوئی شناختوں اور ناموں کی دنیا پر غور کرنے کا موقع میسر آیا ہے۔ وہ دنیا جس میں ہر چیز کی ہئیت اور کیت اُن شناخت ناموں کی محتاج ہے، جو اُسے زمانے کی جانب سے تفویض کیے جاتے ہیں، انھی شناخت ناموں پر غور کرتے ہوئے نظم کے متکلم کو اچانک ہی اپنے جسم پہ لگے اُس کتبے کی غیر موجودگی کا احساس ہوا ہے، جسے ہم 'نام' سے تعبیر کرتے ہیں، اِس غور و فکر نے شاعر کے تخیل کو مہمیز کیا ہے اور اُس کی ساری ذہنی کش مکش نظم کی ساخت میں منقلب ہوگئی ہے۔ یاد رہے کہ نام یا شناخت کے گم ہو جانے کا احساس جدید شاعری کا بنیادی قضیہ رہا ہے، خاص کر وجودی شاعروں کے ہاں 'شناخت کا بحران'، 'فرد کی لایعنیت' اور 'رائیگاں جاتی زندگیوں کا نوحہ' بنیادی مضامین رہے ہیں۔ مجید امجد کی مذکورہ عہد کی نظموں کو ستر کی دہائی میں میں پنپنے والے درج بالا فکری رجحانات کی روشنی میں پرکھنا اس لیے زیادتی ہوگی کہ مجید امجد کے ہاں وجود یا ذات کا تصور کسی اسفل سطح کی بجائے ایک ایسے ایقانِ ذات سے پھوٹتا ہے، جس میں کوئی 'دوسرا وجود' یعنی (The Other) خود اُن کے ارفع و اعلیٰ ہونے کی قوی دلیل فراہم کرتا ہے۔ تبھی تو نظم کی آخری لائنوں میں متکلم اپنی شناخت کا از سرِ نو تعین کرنے کے بعد اس طرح گویا ہوتا ہے:

ایسے میں، اس میرے نام سے خالی ہونے والے خلا میں
جب اک نام نے جھانکا، جانے کس کے نام نے جھانکا

پھر سے، میرے قدموں کے نیچے، میرے باطن کی مٹی تھی
میرے باطن کی مٹی
میرے نام کی جس سے نمو ہے
کیسا نام ہے یہ بھی جو ہر دم ہے
ہم ہی نہیں، اس نام سے نامی! (۵)
(وہ بھی اک کیا نام ہے)

اوپر درج مصرعوں سے یہ بات ایک بار پھر واضح ہو جاتی ہے کہ نظم کا متکلم اپنے اس شعری تجربے میں بار ہا اُن پر اسرار منطقوں کی بازیافت کر رہا ہے، جن تک رسائی کے لیے تخلیق کار کو مکمل خود سپردگی کے عمل سے گزرنا پڑتا ہے۔ یہاں میں ایک آسٹریائی فلسفی مارٹن بوبر کا ذکر کرنا چاہوں گا جس نے ۱۹۲۳ء میں اپنی ایک کتاب Ich and Du یعنی 'میں اور تُو' میں انسانی رشتوں کی دو سطحیں بتائیں تھیں، پہلی شکل I and It (یعنی میں اور یہ) کی تھی جس میں انسان اردگرد بکھرے مظاہر اور اشیاء سے اپنی انفرادی شناخت برقرار رکھتے ہوئے بھی رشتہ رکھ سکتا ہے، جب کہ دوسری سطح I and Thou (یعنی میں اور تُو) کی تھی جہاں انسان اپنی انفرادیت کو بالائے طاق رکھ کر، کسی دوسرے وجود سے ایک ایسے اٹوٹ بندھن میں بندھ جاتا ہے کہ اُسے خود اپنی ذات، دوسرے وجود کی عدم موجودگی میں بالکل نامکمل اور ادھوری لگتی ہے۔ قصہ مختصر یہ کہ مارٹن بوبر کے بقول آخر میں سب رشتے اُس Eternal Thou (یعنی دائمی تُو) سے منسلک ہو جاتے ہیں، جس کی ذات کے اثبات ہی میں ہمیں اپنا اثبات اور دوام نظر آتا ہے۔ مجید امجد کی آخری عمر کی نظموں میں بھی یہ 'دوسرا وجود' وہی Eternal Thou ہے جو جگہ جگہ اپنی موجودگی کا احساس دلاتا ہے۔ یاد رہے کہ اِس دائمی یا ابدی وجود سے مجید امجد کا رشتہ، راشدؔ یا میراؔجی کی طرح مخاصمت کا نہیں بلکہ مفاہمت کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ موت کی بڑھتی ہوئی چاپ اور زمانے کی ناقدری نے اُن کے دل دردمند کو جس احساس نارسائی سے بھرا تھا اُس کا واحد حل اُنھیں 'جو تیرا حکم، جو تیری رضا، جو تو چاہے (۶)' کا خوگر بننے میں نظر آیا تھا۔ مجید امجد کی آخری دور کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمیں 'حقیقتوں کی وہ معجزانہ تقلیب جگہ جگہ دکھائی دیتی ہے' جسے ایڈورڈ سعید نے شیکسپیئر، چاسر، سوفوکلیز اور ابسن کے آخری عمر کے فن پاروں میں دریافت کیا تھا۔ درج بالا معروضات کی مزید توثیق کے لیے مجید امجد کی ایک نظم 'دنوں کے اس آشوب' ملاحظہ فرمایئے جس سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ مجید امجد کی نظموں کے اِس 'رنگِ آخر' کو سمجھنے کے لیے اُس 'میں' اور 'تُو' کے باہمی رشتے کو سمجھنا ازحد ضروری ہو جاتا ہے، جس نے نظم نگار کو اُس کی آخری سانس تک تسلیم و رضا کا خوگر بنا رکھا تھا۔

دنوں کے اس آشوب کے ساتھ اِک تیرے ذکر کا امن بھی جس کو مل جائے
اس کی خاطر ساری مٹھاسیں تیرے نام میں ہیں

تو ہی جس کی خاطر چاہے اپنے نام میں اپنی کشش رکھ دے
تیرے امر، تری منشائیں جس کے بھی حصے میں آجائیں،
نہیں تو باقی کیا ہے، مٹی میں مل جانے والی عمریں، مجھ جیسی
میں، جس کے۔۔۔دل کی موت میں اِک یہ ڈھارس جیتی ہے
شاید یوں ہو، سب کچھ تیرے کرم کی رمزیں ہوں،
میرا ایسے ایسے گمانوں میں گم رہنا بھی، شاید تیرے کرم کی رمزیں ہوں،
ایسے ایسے گمان
شاید تو
خود ہی اپنے آپ کو میرے دل سے بھلوا دیتا ہے
اور پھر خود ہی میری بھول پہ مجھ سے خفا ہو جاتا ہے
یوں دھتکارا ہوا میں جا گرتا ہوں، لوہے کی گردن والی ان کاٹھ کی روحوں میں
جن کے آسیبوں سے بچنے کی کوشش پھر مجھ کو تیرے امروں میں لے آتی ہے
اور پھر میری سانسوں میں پھر سے وہ تسبیحیں گرداں ہو جاتی ہیں، جن میں تیرے نام کے دانے
ہیں
اے وہ جس کے نام کے میٹھے ورد میں ازلوں سے وارد ہیں،
سارے زمانے، سارے ابد(۷)

حواشی:

۱۔ خواجہ محمد زکریا''مجید امجد سے ایک مکالمہ''مشمولہ مجید امجد: نئے تناظر میں،مرتبہ:احتشام علی (ملتان:بیکن بکس،۲۰۱۴ء)،ص ۲۵۔

۲۔ مجید امجد، کلیاتِ مجید امجد،مرتبہ:خواجہ محمد زکریا(لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء)،ص ۴۶۷۔

۳۔ ایضاً،ص ۴۶۸۔

۴۔ ایضاً،ص ۴۹۱۔

۵۔ ایضاً،ص ۴۹۲۔

۶۔ ایضاً،ص ۷۱۶۔

۷۔ ایضاً،ص۵۵۸۔

مآخذ

۱۔ احتشام علی،مرتب مجید امجد: نئے تناظر میں۔ملتان:بیکن بکس،۲۰۱۴ء

۲۔ مجیدامجد، کلیاتِ مجید امجد،مرتبہ:خواجہ محمد زکریا۔لاہور:الحمد پبلی کیشنز،۲۰۰۳ء